ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.2(2024)
(April to June)

مبین مرزا کی افسانہ نگاری اور سماجی تناظر

Mubeen Mirza's Short Story Writing and the Social Context

ڈاکٹر سفیر حیدر
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
فیصل شہزاد
وزٹنگ لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

Dr. Safeer Hyder
Associate Professor, Department of Urdu, GC University, Lahore
Faysal Shahzad
Visiting Lecturer, Department of Urdu, GC University, Lahore

Abstract:
Mubeen Mirza's fiction writing stands at the intersection of narrative depth and sharp social commentary. His works often portray marginalized voices, delving into themes of Identity, displacement, and class disparity. With a realist yet empathetic lens, Mubeen Mirza captures the psychological complexity of his characters. He draws attention to the socio-political dynamics that shape everyday life in South Asia. The column highlights how Mubeen Mirza's prose acts as both art and activism. His narratives are rich in cultural nuance and historical" ntex'. Mubeen Mirza doesn't shy away from critiquing systemic Injustice. Instead, he uses storytelling to challenge dominant Ideologies. His fiction becomes a mirror to society's overlooked truths. The column ultimately positions him as a socially conscious literary force.

Keywords: Mubeen Mirza's fiction, intersection, marginalized voices, psychological complexity, narratives, socially conscious.

مبین مرزا عہدِ حاضر کے متحرک افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانوی دنیا میں بڑا تنوع ہے۔ زندگی جیسی وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے افراد کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بنیادی دلچسپی انسانی رویوں کا خطہ ہے۔ ان کے کرداروں کے محسوسات و خیالات کی دنیا میں بھی بڑا تنوع ہے۔ انھوں نے اپنے اطراف کی سماجی صورت حال کے بیشتر رنگوں کو اپنی کہانیوں میں سمیٹا ہے۔ سماج پر ان کی گہری نظر ہے اور وہ اس کے نبض شناس معلوم ہوتے ہیں۔ معاصر سماجی منظر نامے کا انجذاب سطر سطر میں نمایاں ہے البتہ کئی پہلو بار بار اور شدت کے ساتھ سامنے لائے گئے ہیں۔ اور کچھ معاشرتی جہات کو ان کے افسانوں میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

مبین مرزا بھی جب کراچی شہر کی ابتری کو دیکھتے ہیں تو اُس پر افسردہ نظر آتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب یہ شہر پاک سرزمین کا دارالحکومت ہوا کرتا تھا۔ اسے روشنیوں کا شہر اور عروس البلاد کہا جاتا تھا۔ اس شہر کی چکاچوند آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ لیکن پھر یہاں

لوٹ مار کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے کبھی تھمنے کا نام ہی نہیں لیا۔ بھتہ خوری کا بازار گرم ہوا۔ لوگوں کو دن دہاڑے اغوا کیا جانے لگا۔ اس اجتماعی صورت حال نے کراچی کے باسیوں کو ایسی بے یقینی کی طرف دھکیل دیا جہاں سے نکلنا اُن کے لیے ناممکن ہو گیا۔ مبین مرزا کے افسانہ "خوف کے آسمان تلے" کا ایک کردار پروفیسر اس شہر کا منظر نامہ یوں بیان کرتا ہے:

> یہاں تو کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس شہر کے باسی پر غمال بنا لیے گئے ہیں۔ مختلف سیاسی گروہوں نے شہر کے مختلف حصوں پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ سب ... ہم سب قیدی ہیں یہاں کوئی اپنی مرضی سے نہیں جی سکتا۔ جنگل کا قانون ہے یہاں"(۱)

اس افسانے میں پروفیسر نے کراچی کا جو منظر نامہ بیان کیا ہے اس سے اس شہر کی حالت زار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی بھی مجھے اس شہر کے باسیوں کے ساتھ کوئی بھی حادثہ ہو سکتا ہے۔ کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں کہ آنے والی گھڑی ان کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ کیونکہ شہر پر مختلف سیاسی گروہوں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ اور شہر کے باسی ان جنگی قیدیوں کی طرح ہیں جن کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ اُن کی حیثیت جانوروں سے زیادہ نہیں ہے، جنھیں جس سمت بھی ہانکا جاتا ہے وہ ادھر ہی چل پڑتے ہیں۔ اب اس شہر کے باسی اس سے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ وہ اس وقت کو یاد کر رہے ہیں جب یہ شہر امن کا گہوارہ ہوا کتا تھا۔ جب یہ سمندر سے بھی زیادہ وسیع القلب تھا۔ لیکن اب اس نے اپنے باسیوں کو ایک ایسی تصویر کی جانب دھکیل دیا ہے کہ ان کے ساتھ کسی بھی وقت کوئی بھی ساتھ ہو سکتا ہے۔ ایک خوف ہے جس نے ان کے اندر مستقل ڈیرے جما لیے ہیں۔ اس شہر میں کوئی بھی شخص کسی وقت دوسرے کی گولی کا نشانہ بن جائے یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ کتنے ہی بے قصور لوگ لوٹ مار کرنے والوں کی بھینٹ چڑھے۔ جو کسی کھاتے میں نہیں گئے۔ وہ کسی گنتی میں شمار نہیں ہوئے۔ اور نہ ہی انھیں کسی گولی کا نشانہ بنانے سے پہلے یہ بتایا گیا کہ ان کا قصور کیا تھا۔ اس شہر کی مجموعی صورت حال نے ہر طبقے اور انفرادی طور پر ہر شخص کو متاثر کیا ہے۔ دہشت گردی اور ہم دھماکوں سے شہر کا کوئی بھی کونا نہیں بچ پایا۔ یہاں تک کہ اس نے عبادت گاہوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کہاس صورت حال سے کوئی بھی طبقہ محفوظ نہیں ہے۔ کتنے ہی گھر اور محلے ایسے ہیں جو اس شہر کی دہشت گردی نے اجاڑ دیے ہیں۔ اور کتنے ہی ان بم دھماکوں کی زد میں آکر معذور ہو گئے۔

کراچی شہر میں کبھی مروتیں اور محبتیں ہوا کرتی تھیں۔ مادی ترقی نے لوگوں کی روایات ترجیحات اور رویوں میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ وہ لوگ جن کو اس شہر نے نئی پہچان دی وہ بھی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی ڈھانچے کے زوال پذیر ہونے کے غم میں بے بس اور مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ کراچی شہر جدید دور کی نئی مصیبتوں اور مشکلات کا شکار ہے۔ دہشت گردی کے واقعات سے سارا معاشرہ اذیت اور خوف میں مبتلا ہے۔ بے قصور لوگ گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ خوف اور دہشت کی فضا سے سارا ماحول افسردہ ہو چکا ہے۔ اس صورتِ حال نے جہاں ہر طبقے کو متاثر کیا، وہاں ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ مبین مرزا ان ادیبوں میں سر فہرست ہیں جنھوں نے کراچی کی اس ابتر صورتِ حال کو محسوس کیا اور اُسے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔

مبین مرزا کے ہاں تہذیبی زوال، شکست وریخت اور بدلتی قدروں کے خلاف احتجاج بھی نظر آتا ہے۔ وہ ان بدلتی قدروں پر حیرت زدہ نظر آتے ہیں اور کسی طرح اس طوفان کو روکنا چاہتے ہیں۔ جو اب تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔ اور ہر چیز اس کی لپیٹ میں آرہی ہے۔ مبین مرزا نے اپنے دوسرے افسانوی مجموعے "زمینیں اور زمانے" کے پہلے ہی افسانہ مجھولی بسری عورت" میں انھی بدلتی قدروں اور تہذیبی زوال کو موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے کا کردار منصور ایک جگہ کہتا ہے:

"ہمارے ہاں پچھلے پندرہ سترہ برسوں میں بہت کچھ بدلا ہے ۔ بڑی تیز رفتار
تبدیلی آئی ہے، جیسے طوفان آتا ہے، درختوں کی جڑیں اکھاڑنے اور مکانوں کی
چھتیں اڑانے والا طوفان جس کے بعد سارا نقشہ ہی بدل جاتا ہے"(۲)

قدریں بہت تیزی سے بدل گئی ہیں۔ کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب ہمارے سامنے شہروں اور گھروں کا ایک اور نقشہ تھا لیکن اب بالکل اور ہے۔ صرف چند برسوں میں یہ تبدیلی کسی طوفان کے مانند آئی ہے۔ اک ایسا طوفان جو ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ جس کے بعد کا نقشہ ہی سرے ہی بدل جاتا ہے اور ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یہاں سید محمد اشرف کا ناول "آخری سواریاں" ذہن میں آتا ہے۔ یہ ناول ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے زوال اور بدلتی قدروں کے بیان سے عبارت ہے۔ یہ ناول تہذیبی زوال اور بدلتی قدروں کا استعاراتی اظہار ہے۔ یہاں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ ہماری قدریں کس طرح بدل رہی ہیں اور ان کو تبدیل کرنے میں کونسی وجوہات کارفرما ہیں۔ اس ناول سے ایک اقتباس دیکھیں:

"نانی امی کے گھر اور پنڈت ماما کے مکان کی دیوار مشترک تھی۔ دیوار کے دونوں
طرف دونوں گھروں کے صحن تھے اور دیوار کے نیچے وہ ساجھے کا کنواں تھا جو
آدھے چاند کیشکل میں دیوار کے اِدھر اُدھر دونوں صحنوں میں استعمال ہوتا تھا"
(۳)

ناول نگار کی تخلیقی بصیرت کی داد دیجئے چاند ایک مخصوص حلقے والوں کے لیے تہذیبی علامت ہے۔ چاند آدھا ادھر اور آدھا اُدھر ہے۔ اور کنواں جو سیراب کرتا ہے، دو الگ الگ مکتبہ فکر کے افراد کی سیرابی کے لیے ایک ہی کنواں ہے۔ یعنی دونوں کی فکری سیرابی کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یہ وہ قدریں ہیں جو کبھی ہمارے سماج کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔ مبین مرزا نے انھی پرانی قدروں کا تذکرہ افسانہ "بھولی بسری عورت" میں یوں کیا ہے:

"شام کو جب ان کی کوٹھی کے صدر دروازے کے سامنے دالان میں نوکر چھڑکاؤ
کر کے کرسیاں اور مونڈھے لگاتے اور حقہ لا کر رکھتے تو ملک صاحب وہاں آ بیٹھتے
۔ان کے کئی دوست احباب بھی آجاتے اور رات گئے تک یہ بیٹھک چلتی"(۴)

لیکن پھر ان قدروں کو جیسے نظر لگ گئی۔ ان کا ایسا زوال شروع ہوا جس نے پھر کبھی تھمنے کا نام ہی نہیں لیا۔ انھیں مادیت پرستی کھا گئی یا کوئی اور چیز، لیکن پھر نہ وہ چھڑکاؤ اور مونڈھے رہے اور نہ ہی رات گئے تک بیٹھنے والے وہ دوست احباب۔ ان قدروں کے مہندم ہونے پر مبین مرزا بھی بے چین نظر آتے ہیں۔ وہ حیرت زدہ اور بے یقینی کی کیفیت میں دکھائی دیتے ہیں۔ جب مادیت پرستی کا دور شروع ہوا تو پھر وہ ہماری تہذیب اور پرانی قدروں کو کھا گیا۔ اس کی لپیٹ سے کوئی بھی چیز نہیں بچ پائی۔ بازار اس قدر پھیلے کہ اُنھوں نے گزرگاہوں کو بھی نہیں بخشا۔ جہاں پہلے پرانی طرز کی کوٹھیاں ہوا کرتی تھیں، جو کبھی ہماری ثقافت کا حصہ تھیں، اب اُن کی جگہ شاپنگ سنٹرز نے لے لی ہے۔ اور یہ وبا ایسی پھیلی کہ اس میں مسلسل اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ مبین مرزا افسانہ "امانت" میں ملتان شہر کی بدلتی قدروں کا تذکرہ اس طرح سے کرتے ہیں:

"گاڑی اب گھنٹا گھر چوک سے گزر رہی تھی، لیکن یہاں تو اب نقشہ ہی کچھ اور
تھا۔ وہ پھولوں کے ٹوکرے لے کر بیٹھنے والے کہیں نظر آ رہے تھے نہ وہ منکے کی

قلفی بیچنے والی کی دکان تھی اور نہ ہی وہ برابر والا ہوٹل تھا جس کے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے لوگ مٹھی چاپی کراتے رہتے تھے۔ وہ گولی والی بوتل کی دکان بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ گھنٹاگھر کی عمارت جہاں بلدیہ کے دفاتر تھے اور کبھی یہاں بلدیاتی نمائندوں کا اجلاس ہوا کرتا تھا، اب وہ کچھ سے کچھ ہو گئی تھی "(۶)

مادیت پرستی کے بھنور نے ہماری قدروں کو ایسے ہڑپ کیا کہ پھر نہ تو کہیں وہ پھولوں کے ٹوکرے لے کر بیٹھنے والے نظر آئے۔ اور نہ ہی وہ مٹکے کی قلفی بیچنے والے کی دکان کا کوئی نام و نشان رہا۔ ہوٹل کے سامنے بیٹھنے والے لوگ بھی نہ جانے کس کشتی میں سوار ہو گئے یہ کسی کو بھی خبر نہیں۔ انھی قدروں کے زوال پذیر ہونے پر مبین مرزا بے یقینی اور بے بسی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایک ایسے بھٹکے ہوئے راہی کی طرح جو ان قدروں کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا کر مگر حالات کے آگے بے بس ہے۔ طبقاتی کش مکش کو بھی مبین مرزا نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس طبقے کے ساتھ ناروا سلوک پر کبھی وہ حیرت زدہ اور کبھی افسردہ نظر آتے ہیں۔ مبین مرزا کے افسانہ ریت کی دیوار سے ایک اقتباس دیکھیں جو اسی صورت حال کا منظر نامہ ہے:

"دونوں بچے اطمینان سے پہلے روکھا نوالہ منہ میں ڈال کے کر کر چباتے، پھر چانے کا گھونٹ بھر کے اسے حلق سے نیچے اُتارتے۔ ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، روز کا معمول تھا۔ منشی جی کی پنشن میں اب انھیں یہی سوکھی اور سادہ روٹی جزاتی تھی "۶

یہ طبقہ ایک ہی سرکل میں گھومتے ہوئے اب ایسا عادی ہو چکا ہے کہ اسے اب اس کی مشکلات محسوس ہی نہیں ہوتیں۔ یعنی بچے پہلے ایک روکھا نوالہ منھ میں ڈال کر اُسے چباتے ہیں پھر چانے کا گھونٹ بھر کے اُسے حلق سے نیچے اُتارتے ہیں۔ اور ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نئی بات اس لیے نہیں ہے کیوں کہ انھیں اس سے اچھا کبھی نصیب ہی نہیں ہوا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ازل سے ابد کے خزانوں سے اُن کا بس یہی حصہ ہے۔ یعنی ایک طرف تو خوارک، برانڈ لباس اور رہائش بصورت محلات دستیاب ہیں۔ سرمایہ دار حکمران طبقے کے چند افراد پر مشتمل خاندان سیکڑوں اور ہزاروں کنال پر محیط محلات میں رہتے ہیں۔ اُن کے لیے ہر طرح کی آسائش میسر ہے۔ یوں سمجھیں کہ دنیا والوں پر ان کی حکمرانی ہے۔ اور دوسری طرف وہ طبقہ ہے جس کے باسیوں کو زندگی میں اگر ایک بار پیٹ بھر کے کھانا مل جاتا ہے تو وہ بقیہ عمر اُسی دن کو یاد کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ اسی طبقاتی تفریق اور نچلے طبقے کی حالت زار کو مبین مرزا نے موضوع بنایا۔ اُن کے ہاں اس طبقے کی حالتِ زار پر دکھ کا اظہار ملتا ہے۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ایک ہی زمین پر بسنے والے انسانوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیوں نہیں ہو رہا؟

عہد حاضر میں جہاں افراتفری کا سماں ہے۔ مادیت پرستی کا راج ہے۔ اور انسان دوسرے انسان کے خون کا پیاسا ہو چکا ہے۔ وہیں کچھ انسان ایسے بھی ہیں جن میں نیکی کی رمق ابھی باقی ہے۔ جہاں ایک طرف انسان لاشیں بچھانے میں مصروف ہیں، وہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو انسانیت کے زخموں پر چھاہے کھنے میں لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی بستی جب سیلاب کی نذر ہو جاتی ہے اور اس کے باسی اور مویشی ان ریلوں میں بہہ جاتے ہیں۔ جو بچ رہتے ہیں وہ زمین بوس ہوتے جھونپڑوں سے نکل کر کھلے آسمان تلے آجاتے ہیں۔ تو انسانیت کا یہی ایک ٹولا ان کا سہارا بنتا ہے۔ اور اپنی زندگیوں کی فکر کیے بغیر اُن کے لیے جنگ لڑتا ہے۔

مبین مرزا نے جہاں اس طبقے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جس کا مقصد صرف لوٹ مار کرنا اور دولت کے مینار کھڑے کرنا ہے۔ جنھیں انسانیت سے کوئی غرض نہیں۔ جس کا سب سے بڑا مقصد سرمائے کا حصول ہے، چاہے وہ جس طرح سے بھی حاصل ہو۔ وہیں انھوں نے ایک ایسے گروہ کو بھی افسانوں کا موضوع بنایا جس میں اچھی نیکی کی رمق موجود ہے۔ اسی بربریت کے عالم میں یہ وہ قلیل انسانی گروہ بھی زندہ ہے جو دوسروں کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیتا ہے۔ مبین مرزا نے افسانہ "خوف کے آسمان تلے" میں جہاں ایک طرف کراچی شہر کی ابتری کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ شہر اب وحشیوں اور درندوں کا شہر ہو چکا ہے۔ یہاں ہر بربریت اور سفاکی اپنے عروج پر ہے۔ یہ بالکل غیر انسانی صورت حال ہے۔ وہیں دوسری طرف کہتے ہیں:

> "انسانیت اس شہر سے ہرگز ختم نہیں ہوئی۔ یہاں اکثریت انسانوں ہی کی ہے۔ لیکن یہ اکثریت درندوں کی اقلیت کے آگے بے بس ہے، لوگ نہتے ہیں، مجبور ہیں، لیکن اس لیے بھی اور مجبوری کے عالم میں بھی ان کے اندر کی انسایت زندہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کے مسلوں کو سمجھتے ہیں، کڑے وقت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں"۷

یہاں مبین مرزا کی مثبت سوچ واضح ہے کہ جب وہ بربریت کے عالم میں بھی کہیں نہ کہیں سے انسانیت کو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کراچی جیسا شہر جو درندوں کی بستی بن چکا ہے، وہاں سے بھی انسانیت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہاں اکثریت انسانوں ہی کی ہے۔ لیکن مسلہ یہ ہے کہ یہ اکثریت درندوں کی اقلیت کے آگے بے بس اور مجبور ہے مگر اس بے بسی اور مجبوری کے عالم میں بھی اُن کے اندر انسانیت زندہ ہے۔ اور یہ انسانوں کا ایسا گروہ ہے جو دوسروں کے مسائل کو سمجھتا ہے اور مشکل وقت میں ہمیشہ ان کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔ انسانیت اس دھرتی کا سب سے حسین جذبہ ہے۔ جہاں ایک طرف اس دھرتی پر لوٹ اور بھتہ خوری کا بازار گرم ہے۔ وہیں ایسے انسانوں کی کثیر تعداد بھی موجود ہے جو خود کو دوسروں کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ مبین مرزا نے بھی اسی احساس کو واضح کیا ہے کہ انسانیت اس دھرتی سے ابھی ختم نہیں ہوئی۔ مبین مرزا کے ہاں تقسیم در تقسیم کا المیہ بھی موجود ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ المیے ایک دم سے جنم نہیں لیتے۔

ان کی پرورش برسوں ہوتی ہے۔ کئی سازشیں اور مفاد پرستیاں جب ملتی ہیں تب کوئی سانحہ جنم لیتا ہے۔ اُن کے نزدیک بنگلہ دیش کی علیحدگی بھی کسی ایک دن میں نہیں ہو گئی بلکہ اس کے پیچھے ایک پوری داستان اور کئی لوگ کارفرما ہیں۔ جب اس کی علیحدگی کے اسباب پہنچتے رہے تب اس پر نہیں سوچا گیا لیکن بعد میں اس پر ہاتھ ملتے رہے، جب ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ بعد میں اس پر نوحہ خوانی کرنے کا کیا فائدہ یہ تو اُس وقت سوچنا چاہیے تھا جب یہ سارا جال بچھایا جا رہا تھا۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے اہل اقتدار اس سے واقف نہیں تھے۔ سب کو اپنے مفادات سے غرض تھی اور سمجھی اقتدار میں آنا چاہتے تھے، وہ بھی جو ۱۹۷۰ کا الیکشن ہار گئے تھے اور وہ بھی جو بھاری اکثریت سے یہ الیکشن جیت گئے تھے۔ اسی اقتدار کی ہوس نے ملک کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ اور ظلم تو یہ ہے کہ یہ سازش اقتدار کے جھوکے چند درندوں کی تھی لیکن اس کی قیمت پوری قوم نے ادا کی۔ مبین مرزا کے افسانہ "بے خواب پلکوں پر ٹھہری رات" میں ایک جگہ احتشام، پھوپھا سے کہتا ہے:

پھوپھا دکھ تو اسی بات کا ہے جو بعد میں روتے تھے بلبلاتے تھے۔ یہ فیصلے اُن کے نہیں تھے۔ یہ تو چند لوگوں کا کام تھا۔ چند ذہنوں نے سازشوں کا جال بچھایا تھا اور پوری قوم دام میں آگئی۔ سازشی با اختیار تھے، اس لیے کھل کھیلے۔ کامیاب ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش ہم نے نہیں بنایا لیکن اس ہوارے کے جتنے دکھ تھے، سب کے سب ہمارے حصے میں آئے"(۸)

پاکستان کو تقسیم کرنے کی سازش چند ذہنوں کی تھی۔ چونکہ وہ سازش کرنے والے سمجی با اختیار تھے اس لیے انھوں نے تمام مسائل کو بروئے کار لایا اور اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے۔ جنھوں نے اقتدار کے حصول کے لیے پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا وہ تو اہل اقتدار بن بیٹھے، لیکن اس کی قیمت پوری قوم نے ادا کی۔ اور اس ہوارے کے جتنے بھی دکھ تھے وہ سب کے حصے میں آئے۔ اقتدار کے پجاریوں کے ذاتی مفادات نے ہمارے ایک بازو کو کاٹ کر الگ کر دیا۔ یہ اس مخصوص طبقے کے باہمی اختلافات ہی تھے جنھوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک قوم نہیں بننے دیا۔ مبین مرزا کا خیال ہے کہ جنھوں نے یہ سازش کی وہ کوئی باہر سے نہیں آئے تھے بلکہ ہمارے اپنے ہی تھے۔ افسانہ "بے خواب پلکوں پر ٹھہری رات" میں ایک جگہ احتشام، پھوپھا سے کہتا ہے:

> "جنھوں نے یہ گل کھلانے کیا وہ باہر سے آئے تھے۔ ہاتھیانا! سب تمہارے اپنے
> تھے۔ بٹوارے کا رونا کس کارن۔ رونا تو اس پہ چاہیے، تم نے اختیار دینے واسطے
> ایسے لوبھی، لالچی، ابنِ الوقت، نفس مرید چنے تھے"(۹)

مبین مرزا نے تقسیم در تقسیم کے اس المیے کا زمہ دار اپنوں کو ہی ٹھہرایا۔ اُن کے نزدیک اِس ملک کو تقسیم کرنے میں کوئی بیرونی سازش کار فرما نہیں تھی۔ بلکہ یہ سب ہمارے اپنوں کا ہی کیا دھرا ہے۔ اور ظاہر ہے جب کسی گھر کو اُس کے اپنے ہی چراغ جلانے لگ جائیں تو اُس کا کیا حشر ہو گا؟ اور یہ سب اُس وقت ہوا جب ابھی پہلی تقسیم کے زخم تازہ تھے۔ انسان پر جنگوں اور بم دھماکوں کے نفسیاتی اثرات کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنی جنگوں کی اپنی تاریخ ہے۔ اگر جنگوں اور بم دھماکوں کی تاریخ پر ایک نظر دوڑائی جائے تو یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ جنگوں میں براہ راست نشانہ بن کر مرنے والوں سے کئی گنا زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو جنگوں کا نفسیاتی شکار بنتے ہیں۔ جنگ اور مرگ انسان پر انتہائی گرے نفسیاتی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ مبین مرزا نے بھی سراج نامی ایک ایسا ہی کردار تخلیق کیا ہے جو جنگوں اور بم دھماکوں کی وجہ سے نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔ دنیا کی اِجتماعی بگڑتی صورتِ حال نے اُس کے اعصاب پر ایسے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں کہ اب وہ دنیا سے کٹ چکا ہے۔ اپنی دھماکوں کی خبر نے سراج کی نفسیات پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ وہ کسی بھی طرح سے انھیں روکنا چاہتا ہے۔ اسی کش مکش نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ یہ صرف ایک کردار نہیں بلکہ ایسے بے شمار لوگ ہیں جو اس صورت حال سے بری طرح متاثر ہوئے۔ اور تمام عمر زندگی کی طرف نہیں لوٹ پائے۔ دنیا کے اس بگڑتے ہوئے منظر نامے نے اُن کی نفسیات کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ اب وہ اس دنیا سے ہی فرار ہونا چاہتے ہیں۔ افسانہ "خواب ہارا آدمی" میں سراج اپنی ہوئی سائرہ سے ایک جگہ کہتا ہے:

یہ دنیا ہمت منحوس ہو گئی ہے، اب رہنے کے قابل نہیں رہی۔۔۔ اگر میں تم سے کہوں کہ چلو کہیں جنگل میں کسی ویرانے میں چل کر رہتے ہیں تو تم چل دو گی؟(۱۰) ان جنگوں اور بم دھماکوں کے بڑھتے رجحان نے حساس دلوں کے اندر یہ بات بیٹھا دی ہے کہ یہ دنیا اب منحوس ہو چکی ہے۔ اب یہ کسی طرح بھی رہنے کے قابل نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب اس سے فرار ہونا چاہتے ہیں۔ بارود کی بُو سے بھری اس دنیا سے کہیں بہت دور نکل جانا چاہتے ہیں۔ گوپال متل افسانوی مجموعہ "جنگی افسانے" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

کبھی وقت تھا کہ یہ تباہ کاریاں صرف عرصہ کارزار تک محدود ہوتی تھیں۔ لیکن
اب ایسا نہیں رہا، اب جنگ تمام ملک پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے اور کوئی
مرد، عورت، بچہ یا بوڑھا اس کی تباہ کاریوں کی زد سے نہیں بچ سکتا"(۱۱)

جنگوں کے اثرات کسی بھی خطے کے تمام افراد براہ راست قبول کرتے ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی ایک مخصوص طبقہ اس صورتِ حال سے متاثر ہو اور باقی اس سے بچ جائیں۔ بارود کے اثرات جس خطے کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں پھر وہاں رکچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ دنیا کی اس بھیانک تصویر کو دیکھتے ہوئے لوگ اپنی نسل کو آگے بڑھانے سے ڈر رہے ہیں۔ جنگوں اور بم دھماکوں نے لوگوں کو نفسیاتی طور پر اس قدر متاثر اور خوفزدہ کر دیا ہے کہ اب وہ اس دھرتی پر اپنی نسل کو لا کر ان بم دھماکوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔ اب وہ اس افسانہ کے کردار سراج کی طرح نفسیاتی مریض بن چکے ہیں۔ جب وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی آدمی جسے اپنی ہونے والی اولاد سے محبت ہو اُسے چاہیے کہ بچے نہ پیدا کرنے کا تہیہ کر لے، تو اُس کے اندر اس منظر نامے کا خوف اور اس کے اثرات واضح ہیں۔ اور یہ کردار ہر اُس شخص کی نمائندگی کر رہا ہے جس پر اس صورت حال کے نفسیاتی اثرات ہیں۔ افسانہ "خواب بارا آدمی" میں ہی ایک جگہ سراج اپنی بیوی سائرہ سے کہتا ہے:

سائرہ! میں بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ دنیا خراب ہو چکی
ہے۔ یہ کسی امن پسند اور محبت کرنے والے آدمی کے رہنے لائق نہیں رہی۔
سیاست دانوں اور ایٹم بموں کے نرغے میں آئی ہوئی اس دنیا میں اپنی اولاد کو لانا
اُس کے ساتھ بدترین ظلم کرنا ہے۔(۱۲)

حال میں جینا ہمیشہ ہی ایک مشکل تجربہ رہا ہے۔ بیشتر کردار ماضی میں ہی جی رہے ہوتے ہیں اور اس سے کبھی لکل نہیں پاتے۔ انسان کے ارد گرد جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں وہ تبدیلیاں اور نیا زمانہ ترقی کے نام پر اُس کی اکتاہٹ اور اکیلے پن میں اضافہ کر رہا ہے۔ ماضی میں راحت اور سکون کا سامان بننے والی چیزیں رفتہ رفتہ ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ اور انسان ترقی کے سیلاب کے سامنے اکیلا کھڑا پچھلے زمانے کو یاد کر رہا ہے۔ وہ زمانہ جو سست رفتار تھا اور وہ اُس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ لیکن اب جب وہ دو قدم چلتا ہے تو دنیا اس سے بہت آگے نکل چکی ہوتی ہے اور وہ راستے کے کنارے بیٹھ کر گئے دنوں کا ماتم کرنے لگتا ہے۔ ایک نسل جو ڈھلتی عمر کا شکار ہو رہی ہے اُس کی یادیں اس کے زخم بنتی جا رہی ہیں۔ اور ان زخموں کی دوا بھی یادیں ہی ہوتی ہیں۔ یادوں میں کھو کر پرانی نسل زخموں کو کریدتی بھی ہے اور خود مرہم بھی رکھتی ہے۔ ایک وہ دور تھا جب سازوں اور رواجوں میں زندگی تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں اکتارہ لیے فقیر اور جوگی گاتے ہوئے اکثر مل جاتے۔ میلوں تک سوئی ہوئی دھرتی پر رہٹ کی روں روں سنائی دیتی تھی۔ لیکن اب یہ سب ایک عذاب ہے۔ مبین مرزا کے ہاں بھی اسی ماضی کی بازگشت نظر آتی ہے۔ وہ ان مناظر کو حال میں دیکھنا چاہتے ہیں جو اب گئے زمانوں کی داستان بن چکے ہیں۔ ان زمانوں میں جینا چاہتے ہیں جو دور بہت دور کہیں پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ حال سے زیادہ ماضی میں جیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں وہ اُس زمانے کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو اب مسترد ہو چکا ہے۔ جس کے نشانات نئے زمانے کی گرد میں کہیں کھو گئے ہیں۔ مبین مرزا کے افسانہ "بھولی بسری عورت" سے ایک اقتباس دیکھیں:

یہ سب چہرے، مناظر اور آوازیں تو جیسے گئے زمانوں کی گونج تھے، وہ زمانے جو
دور بہت دور کہیں پیچھے رہ گئے تھے... جب پورا ایک زمانہ مسترد ہو جائے تو اس
کی ایک ساعت کوئی ایک آن بھلا کس کتنی میں ہو گی "(۱۳)

انتظار حسین کے ہاں بھی اسی ماضی کی بازگشت ہے۔ ان کے یہاں پچھتاوے، یادِ ماضی، کلاسیک سے محبت، ماضی پرستی، ماضی پر نوحہ خوانی اور روایت میں پناہ کی تلاش بہت نمایاں ہے۔ پرانی اقدار کے بکھرنے اور نئی اقدار کے سطحی ہونے پر دکھ کا اظہار ملتا ہے۔ انتظار حسین کے بیشتر افسانوں میں ماضی کی بازگشت موجود ہے۔ جہاں وہ کھوئے ہوئے کرداروں اور یادوں کو ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے افسانہ "وہ جو کھونے گئے" سے ایک اقتباس دیکھیں:

"کیا خلقت تھی کہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں، نوجوان افسردہ ہو کر بولا۔ وہ
یادوں ہی یادوں میں دور تک گیا، اس ساعت تک جس ساعت نے اپنی زندگی کا
پہلا بوسہ کسی لب پر ثبت کیا تھا۔ اور اس نے وہ اعلانات کیے جو اس ساعت میں
کیے جاتے ہیں۔ اسنے اس ساعت کو ایک اداسی کے ساتھ یاد کیا"(۱۴)

مبین مرزا کے ہاں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ قوتوں کے عزائم سے باخبر ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ طاقت ور قوتیں دنیا کے سارے ذخائر کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہیں۔ اُن کا افسانہ "یہی تو ہے زندگی" اس حوالے سے ایک مثال ہے۔ مبین مرزا کا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا مسلہ اقتصادیات کا ہے۔ طاقت ور قوتوں کا بنیادی مقصد دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنا ہے۔ یہ قومیں دنیا کے سارے ذخائر کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہیں۔ تاکہ پھر وہ باقی دنیا کو اپنی مرضی سے چلا سکیں۔ ان طاقت ور اور سرمایہ دارانہ قوتوں کا عزم ہے کہ کسی طرح وہ دنیا کے تمام وسائل پر قابض ہو جائیں۔ تیل، گیس، کوئلے، سونے اور ہیرے کے ذخائر ہی نہیں، پانی تک کے ذخائر اُن کے قبضہ میں آجائیں۔ تاکہ ان کا تسلط ہمیشہ قائم رہے۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ یکسانیت اور معمولات زندگی انسان کو کھا جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مبین مرزا کے کردار معمولات زندگی سے اکتائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اِس سرکل سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن بے بسی کا شکار ہیں۔ زندگی کے سرکل میں دوڑتے دوڑتے جب وہ تھک جاتے ہیں اور اُن کی سانسیں پھول جاتی ہیں تو وہ سوچتے ہیں کہ آخر آدمی جیسے ہی کیں چلا جاتا ہے؟ مسلسل ایک ہی زندگی جیتے ہوئے وہ تھک چکے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ معمولات زندگی گھن کی طرح ان کی زندگیوں کو کھانے چلے جا رہے ہیں۔ افسانہ "طلسمی دوڑ" میں اسی سرکل میں گھومتا ہوا ایک کردار ہے۔ ابا کی وفات کے بعد ان کی جگہ پر دفتر میں جونیئر کلرک بھرتی ہو جاتا ہے۔ اور یوں ریلے ریس کی طرح نسل در نسل ایک میدان میں دوڑتا رہتا ہے۔ لیکن اپنی آنے والی نسلوں کو اس سرکل سے نکالنا چاہتا ہے۔

مذہب انسانوں کے درمیان دیوار نہیں ہے لیکن اُسے دیوار بنایا گیا ہے۔ مبین مرزا کا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ غلط استعمال مذہب کا کیا گیا ہے۔ ہر ایک نے اُسے اپنے حساب سے موڑنے کی کوشش کی۔ مذہب نے جن چیزوں کا درس دیا مذہب کے نام پر ہی ان پر قدغن لگایا گیا۔ یوں انسانوں نے ایسی دیواریں کھڑی کر دیں جنھوں نے انھیں ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ حالانکہ مذہب نے وہ دیواریں گرانے کا اور محبت کا درس دیا تھا۔ مبین مرزا نے افسانہ "سفید پھولوں کے اُس طرف" میں دو کرداروں کے ذریعے مذہبی

بحث کو موضوع بنایا۔ کرسچین لڑکی قرۃ العین اور مسلم لڑکے عاطف کی محبت اور دوستی کی کہانی مذہب کے حقیقی درس اور اُس کے غلط استعمال کے گرد گھومتی ہے۔

افسانہ "سفید پھولوں کے اُس طرف" میں ایک جگہ عاطف، قرۃ العین سے کہتا ہے:

"دیکھو قرۃ! مذہب انسان کا قطعی ذاتی معاملہ ہے اور تفریق کم سے کم انسان کا رتبہ بحیثیت انسان تو کم نہیں کرتی۔۔۔۔ سارے مذاہبِ انسان سے محبت کا درس دیتے ہیں" ۱۵

اس کردار کے ذریعے مبین مرزا نے ہمارے اس مذہبی رویے کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں ہم مذہب کو بنیاد بنا کر دوسروں کو خود سے کم تر خیال کرتے ہیں۔ محبتوں کو ختم کرتے ہیں اور اختلافات کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ حالانکہ مذہب تو انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور اُسے کسی دوسرے پر تھوپنے کی ہمیں بالکل بھی ضرورت نہیں تھی۔ مذہبی تفریق کم سے کم انسان کا مرتبہ بحیثیت انسان تو کم نہیں کرتی۔ یعنی انسانیت سب سے پہلے تھی اور مذہب بعد میں۔ لیکن اس کے بالکل الٹ ہوا۔ مذاہب نے جو محبت کا درس دیا تھا انھی کے نام پر اس محبت کو نفرت میں بدل دیا گیا۔

جاگیرداروں کے استحصالی حربوں اور بے حسی کا تسلسل بھی مبین مرزا کے ہاں نظر آتا ہے۔ اُن کا افسانہ "قید سے بھاگتے ہوئے" اسی جاگیردارانہ نظام کی کہانی ہے۔ افسانے میں اس طبقے کی بے حسی اتنا کو پہنچی ہوئی ہے۔ یعنی ایک طرف تو یہ دوسروں کا استحصال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ تمام عمر اُن کا خون چوستا ہے اور اُنھیں صرف اتنا ہی دیتا ہے کہ وہ اس میں کسی طرح زندگی کے دن پورے کر سکیں۔ اور دوسری طرف اس طبقے کی بے حسی کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی صرف اس لیے نہیں کرتے کہ کہیں اُن کی جائیداد تقسیم نہ ہو جائے۔ اس افسانے میں ملکاں بی بی" نامی ایسا ہی ایک کردار ہے جو جاگیردار گھرانے کی واحد لڑکی ہے۔ اُس کے بھائی اس کی شادی محض اس خوف سے نہیں کرتے کہ اُن کی جائیداد تقسیم ہو جائے گی۔ اور اسے تمام عمر اپنے گھر پر ہی بیٹھائے رکھتے ہیں۔

حکمراں طبقے کی ستم ظریفی اور بے حسی کو بھی انھوں نے موضوع بنایا۔ اُن کا خیال ہے کہ عوام کا استحصال کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ حکمراں طبقے کا ہی ہے۔ لیکن یہ طبقہ بہت شاطر ہے اور عوام کی بدحالی کا ذمہ دار ہمیشہ تقدیر کو ہی ٹھہراتا ہے۔ حقیقی روح کی تلاش میں سرگرداں، سماج کے ناروا سلوک سے مضطرب، خاندانی انا کی بھینٹ چڑھنے والے اور جاگیردارانہ نظام کی چکی میں پستے ہوئے کردار بھی اُن کے ہاں نظر آتے ہیں۔

مبین مرزا کی کہانیاں ہمارے سماج کی عکاس ہیں۔ انتظار حسین اور اختر الایمان کی طرح کہیں وہ ماضی کی بازگشت میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں تو کہیں پریم چند کی طرح طبقاتی کش مکش پر افسردہ ہیں۔ اُنھوں نے زبان کے نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ یعنی اُردو کے ساتھ انگریزی اور سرائیکی زبان کو شامل کیا ہے۔ اپنے الفاظ ہونے کے باوجود انگریزی لفاظی کا استعمال کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانے کے تسلسل میں بگاڑ پیدا کر رہا ہے لیکن سرائیکی کا استعمال ایک صحت مند تجربہ ہے۔ دوسری خامی جو مجھے اُن کے ہاں نظر آئی وہ افسانوں کی غیر ضروری طوالت ہے۔ بعض اوقات وہ جزئیات میں جا کے افسانے کا سب سے ضروری عنصر یعنی واحدت تاثر ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا ایک افسانہ ناولٹ کی حد کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، کراچی، اکادمی بازیافت، دسمبر ۲۰۰۴، ص:۶۷

2۔ مبین مرزا، زمینیں اور زمانے، کراچی، اکادمی بازیافت، دسمبر-۲۰۱۵، ص:۱۳

3۔ محمد اشرف، سید، آخری سواریاں، دہلی، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۶، ص:۱۶

4۔ مبین مرزا، زمینیں اور زمانے، ص:۱۷

5۔ ایضاً، ص:۱۹۷

6۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، ص:۱۲۱

7۔ ایضاً، ص:۶۰

8۔ ایضاً، ص:۹۲

9۔ ایضاً، ص:۹۳

10۔ ایضاً، ص:۴۹۔۱۴۸

11۔ گوپال مِتل، دیباچہ: جنگی افسانے، لاہور، نیشنل اکیڈیمی، ۱۹۴۱ء، ص:۷

12۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، ص:۱۴۹

13۔ مبین مرزا، زمینیں اور زمانے، ص:۹

14۔ انتظار حسین، انتظار حسین کے سترہ افسانے، نئی دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاوس، ۱۹۸۰، ص:۱۶

۱۵۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، ص:۱۵۱

References in Roman Script:

1. Mubeen Mirza, Khuf ke Aasman Tale, Karachi, Akidemi Baziyaft, December-2023
2. Mubeen Mirza, Zaminin or Zamane, Karachi, Akidemi Baziyaft, December- 2015, P: 13
3. Muhammad Asharf, Siad, Aakhari Swar”an, (Dahli: Arshiya Publi kitions 2016),p: 16
4. Mubeen Mirza, Zaminin or Zamane, P:17 4.
5. Izan, P: 197
6. Mubeen Mirza, Khouf Ke Asman Tale, P. 121
7. Ibid,P: 60
8. Ibid, P:92
9. Ibid, P: 93
10. Ibid, p: 49-148
11. Gopal Mettel, Preface: Jangi Afsaneh, Lahore, National Academy,1941, P.7
12. Mubeen Mirza, Khouf Ke Asman Tale, P:149
13. Mubeen Mirza, Zaminin ur Zamam, P: 9
14. Intejar Hossein, Intejar Hossein Ke Satra Afsaneh, (New Delhi: Modern Publishing House, 1980), p 16
15. Mobeen Mirza, Khouf Ke Asman Tale, P.159